ماہنامہ غازی کراچی
جولائی 2011ء

سید افتخار جمیل

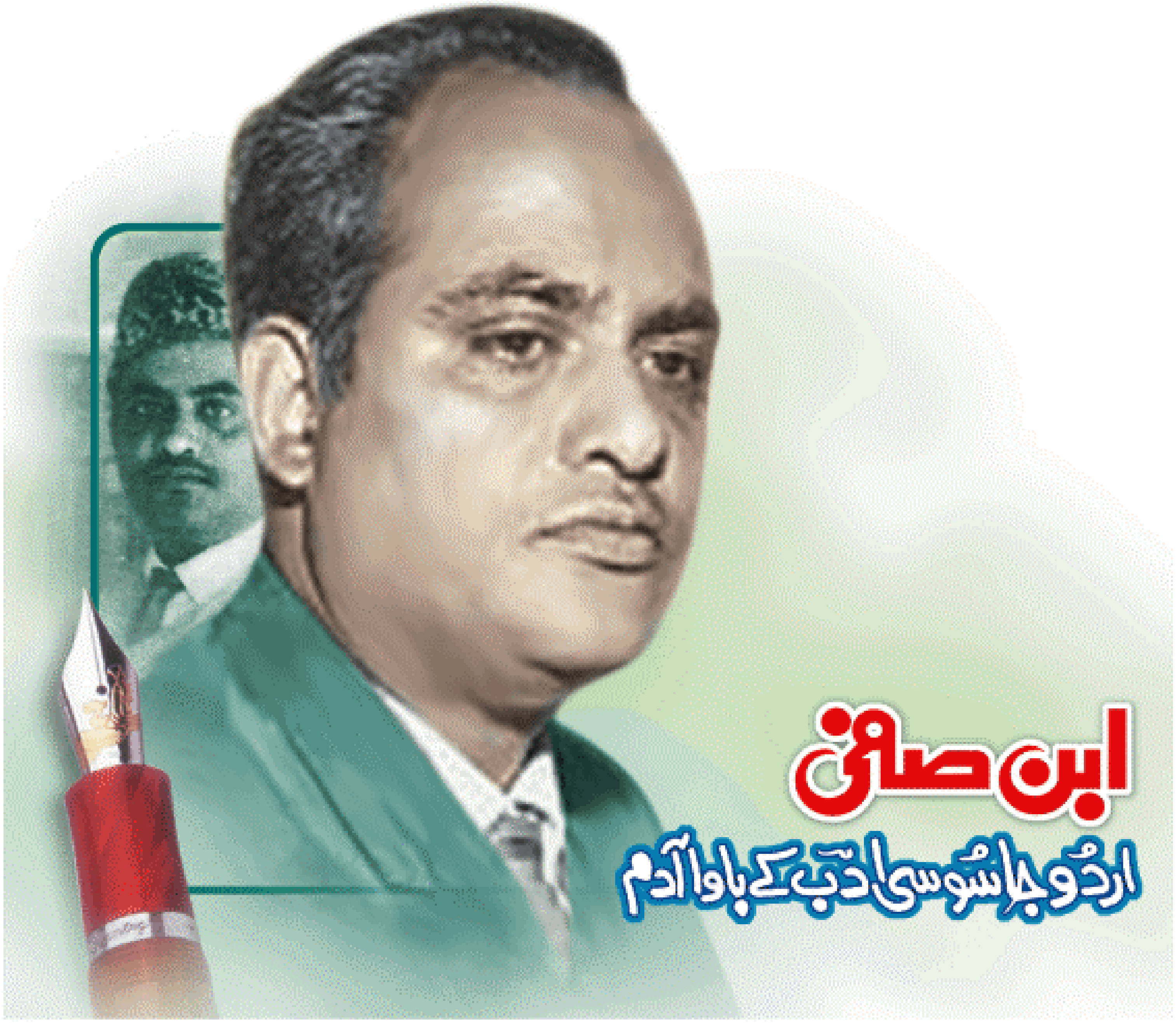

سیکڑوں ناول لکھنے والے ادیب اعزازی کاپی دینے کے خلاف تھے۔ان کی سالگرہ اور انتقال کے موقع پر آپ سے ان کی یادیں شیئر کر رہے ہیں

ابن صفی کے ناول نے ایک صحافی کی جان بچائی

ابن صفی اعزازی کاپی دینے کے سخت مخالف تھے

ان کا کہنا تھا کہ گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا

یہ جنوری 1975 کا ذکر ہے ان دنوں میں اور میرے جیسے بہت سے تازہ بتازہ فارغ التحصیل طلباء قومی ترقیاتی رضا کار پروگرام یا این ڈی پی کے مرکز میں ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ اور دفتری نظم ونسق کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔اس پروگرام میں تربیت کے لئے منتخب کردہ رضا کاروں یا این ڈی وی پیز کو ماہانہ اعزازیہ حکومت کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا لیکن اس کے لئے بینک اکاؤنٹ کھلوانا ضروری تھا۔ ایسے ہی ایک بڑے سے نیشنلائزڈ بینک کی فردوس کالونی برانچ این ڈی وی پیز کے غالباً تین سو رضا کاروں نے یلغار کردی لیکن بینک منیجر جو خیر سے ٹیلی وژن پر نیوز ریڈنگ بھی کرتے تھے کسی طور پر این ڈی پی پیز کے اکاؤنٹ کھولنے پر آمادہ نہ تھے ان کا استدلال تھا یا تو جس وزارت کے تحت یہ اسکیم چل رہی ہے وہ سرکاری طور پر بینک کی انتظامیہ سے اکاؤنٹ کھولنے کی درخواست کرے یا پھر کسی سرکاری بینک میں جا کر اکاؤنٹ کھلوایا جائے۔

بینک میں این ڈی وی پیز کے جم غفیر سے افراتفری کا عالم تھا اور بینک کا کسٹمر ڈیلنگ کا کاروبار بھی متاثر ہو رہا تھا بینک منیجر کی ہدایت پر بینک گارڈز نے رضا کاروں کو عمارت سے باہر کھدیڑنا شروع کر دیا۔ میں اور چند دوسرے سینئر رضا کار منیجر سے کٹ حجتی میں مصروف تھے کہ اچانک پوری عمارت میں ایک غلغلہ سا مچ گیا صفی صاحب آگئے...... صفی صاحب آگئے۔ بینک کے الارم کی گھنٹی بجی۔ایک درمیانہ قد کے صاحب ہلکی سلیٹی رنگ کی شیروانی پہنے ایک ہاتھ میں پان کی چمکتی نقرئی ڈبیہ لئے ہوئے تھے جبکہ ان کے دوسرے ہاتھ میں زردہ، سونف، چھالیہ اور قوام رکھنے کے لئے کڑھا ہوا خوش رنگ بٹوہ لٹکا ہوا تھا۔ان صاحب کے ساتھ غالباً ان کے چار کارندے تھے جن کے کندھوں پر بہت بڑے بڑے کپڑے کے تھیلے لٹکے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے داخل ہوتے ہی بینک کے دوروازے بند کر دیئے گئے منیجر نے لپک کر ان صاحب کا استقبال کیا اور اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں لے گیا۔اسی دوران کارندوں نے میز کے کاؤنٹرز پر کرنسی نوٹوں کی گڈیوں، ڈیمانڈ ڈرافٹ اور پے آرڈر کے پلندوں کے ڈھیر لگانے شروع کر دیئے۔

میں نے اور میرے ساتھیوں نے بینک سے باہر جانا چاہا تو بینک گارڈ نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں اس سے تو تکرار ہونے لگی۔بات زیادہ بڑھی تو منیجر کمرے سے نکلا، ساتھ ہی وہ صاحب بھی تھے جن کی شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ بینک منیجر نے آتے ہی دھمکی دی کہ اگر آپ لوگ زیادہ گڑبڑ کریں گے تو میں آپ کو حوالہ پولیس کردوں گا۔ جواباً میں نے جھلا کر کہا کہ ایک تو آپ ہمیں اکاؤنٹ نہیں کھولنے دیتے اور اب بینک سے باہر بھی نہیں جانے دے رہے۔ یہ سن کر شیروانی میں ملبوس صاحب نے میرے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا:

''میاں! آپ مجھے بتائیں آپ کا کیا مسئلہ ہے؟''۔

منیجر اسی دوران واپس کمرہ میں چلا گیا تھا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں جن میں منظور حسین اور افضال محسن پیش پیش تھے تمام صورتحال گوش گزار کی۔ یہ سن کر وہ مسکرائے۔ ڈبیہ کھول کر پان کی ایک گلوری نکالی ہم تینوں سے پوچھا کہ پان سے شوق فرمائیں گے؟۔ ہماری معذرت پر انہوں نے گلوری کو منہ میں دبایا، بٹوہ میں سے باریک کٹی ہوئی چھالیہ پھانکی اور چند لمحوں بعد با آواز بلند کارندوں کو حکم دیا کہ نوٹوں کی گنتی روک دو۔ اس کے بعد وہ ہم تینوں کو لے کر منیجر کے کمرے میں داخل ہوئے اور یہ حکم نادر شاہی صادر کیا کہ منیجر صاحب! میں نے اس بینک میں اپنا اکاؤنٹ بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سنتے ہی منیجر تو اپنی کرسی سے ایسے اچھل پڑا جیسے اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ ایئر کنڈیشنڈ کمرہ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کی لہر اتر آئی۔

''سر سر، صفی صاحب میرا قصور تو بتایئے؟؟؟''۔

اس نے بڑی لجاجت کے ساتھ استدعا کی۔

جواباً صفی صاحب، جنہوں نے ابتداء میں مجھے اپنا نام اسرار احمد بتایا تھا، گویا ہوئے:

میاں یہ بچے میری قوم کا مستقبل ہیں یہ عملی زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں اور آپ ان کا اکاؤنٹ کھولنے پر آمادہ نہیں۔ تو کیا فائدہ ایسے بینک کا؟ اسی لئے میں نے آپ کے بینک میں اپنا اکاؤنٹ بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور ڈپازٹ کا عمل رکوا دیا ہے''۔

یہ سن کر منیجر مزید پریشان ہو گیا۔ بے ساختہ اس نے باہر نکل کر صورتحال کا جائزہ لیا اور پھر کمرے میں واپس آ کر کہنے لگا:

''صفی صاحب میں ان تین سو رضا کاروں کو بغیر جانے پوچھے کس طرح اکاؤنٹ ہولڈر بنا سکتا ہوں جبکہ ان کا ادارہ بھی کوئی گارنٹی نہیں دے رہا''۔

اس پر صفی صاحب نے مزید کہا:

''بھئی یہ تین بندے جو بیٹھے ہیں ان کی گارنٹی میں دے دیتا ہوں ایک دو دن بعد ان کی گارنٹی پر بقیہ رضا کاروں میں سے کچھ کے اور پھر علی الحساب اسی طرح ہفتے بھر میں بقیہ سب کے اکاؤنٹ کھل سکتے ہیں۔ یہ تو بڑا سیدھا سادھا حساب کتاب ہے آپ نے تو اسے بلاوجہ ایک مسئلہ بنا دیا ارے بھائی کیا بھول گئے آپ وہ وقت جب بینک پرائیویٹ ہوا کرتے تھے تو زیادہ سے زیادہ اکاؤنٹ کھلوانے کے لئے کیا کچھ جتن کئے جاتے تھے''۔

صفی صاحب کی وضاحت سننے کے بعد منیجر کچھ خفیف سا ہو گیا۔ پھر اس نے ایک شیلف میں سے تین فارم نکال کر ہم تینوں رضا کاروں کو دیئے فارم بھرنے کے بعد صفی صاحب نے ان پر اپنے تصدیقی دستخط کئے۔ اپنا نام تو انہوں نے اسرار احمد لکھا تھا لیکن انہوں نے جو دستخط کئے تھے وہ اردو میں تھے اور یہ ان موصوف کا قلمی نام تھا ''ابن صفی''۔

تب جا کر کہیں ہم تینوں پر یہ آشکار ہوا جس شخصیت نے اس بینک میں ہمارے کھاتے کھلوائے ہیں وہ اردو ادب کے عظیم جاسوسی ناول نگار ابن صفی ہیں۔ ابن صفی صاحب کی اس عنایت پر میں نے اور میرے ساتھیوں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ جب ہم ابن صفی صاحب کا شکریہ ادا کر کے بینک سے نکل رہے تھے بینک کے کاؤنٹرز پر بڑی تیز رفتاری سے صفی صاحب کی رقومات ڈپازٹ کرنے کا عمل جاری تھا یہ اس تازہ ترین ناول کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی تھی جو دو ماہ کے وقفے کے بعد پچھلے ماہ ہی منظر عام پر آیا تھا اور اس ناول کا نام تھا ''پاگلوں کی انجمن''۔

75ء کا نصف چل رہا تھا۔ میں نے اس زمانے میں ریڈیو پاکستان کے پندرہ روزہ رسالہ ''آہنگ'' میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ''حریت'' کے سابق میگزین ایڈیٹر سید محمد یعقوب اس زمانے میں ''آہنگ'' کے شعبہ ادارت میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ میں اسرار احمد عرف ابن صفی سے ایک براہ راست انٹرویو کروں۔ ابھی تک تو میں ان سے ایک بالواسطہ انٹرویو میں شریک رہا تھا جو ریڈیو پاکستان کے لیے کیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک دن میں نے اپنے ایک دوست قاضی کفیل کو ساتھ لیا جو صفی صاحب کی کتابوں کے بڑے دلدادہ اور ان سے ملنے کے بڑے شائق تھے، ہم دونوں صفی صاحب کے فلیٹ پر جا پہنچے۔ موصوف نے ہمیں اپنے فلیٹ کے بالکونی والے کمرے میں بٹھایا اور چائے، پان کا پوچھا۔ ہم دونوں نے معذرت کر لی، کیوں کہ میں پان کھاتا نہیں تھا اور قاضی کفیل چائے سے الرجک تھے۔ بہرحال ہم نے وقت ضائع کیے بغیر فوری طور پر مدعا بیان کیا۔ صفی صاحب انکساری سے کہنے لگے:

''بھئی! بہت کچھ شائع اور نشر ہو چکا ہے، اب تو میرے کردار بھی مجھ سے شکوہ کرنے لگے ہیں ان پر لکھنے کے بجائے سیلف پبلسٹی پر وقت صرف کر رہا ہوں''۔

جواباً میں نے اصرار کیا:

''صفی صاحب! جس طرح آپ کی تحریر زندہ جاوید ہیں اسی طرح آپ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پرنٹ میڈیا کے ذریعے قارئین کے سامنے آنا چاہئے جہاں تک ریڈیو کے انٹرویو کا تعلق ہے تو جس نے سنا اس کے لیے تو بہت جانیے، لیکن جس نے نہ سنا اس کو تو تحریر کے ذریعے ہی مطمئن کیا جا سکتا ہے''۔

میرے اس قسم کی سمجھ اور دلائل وقاضی کفیل کی وکالت کے نتیجے میں صفی صاحب ''آہنگ'' کے لیے انٹرویو دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک کاغذ پر مجھے فردوس کالونی کے مکان کا نمبر دے دیا۔ انٹرویو کے سلسلے میں کچھ پیشگی شرائط بھی عائد کر دیں جو کچھ اس طرح تھیں کہ سوالنامہ پیشگی تحریری طور پر دیا جائے گا، جس کے ایک ہفتے بعد انٹرویو کا اہتمام ہوگا۔ انٹرویو لینے صرف مجھے ہی گھر پر آنا ہوگا، زیادہ لاؤ لشکر لانے کی ضرورت نہیں۔

ہماری یہ ملاقات نصف گھنٹے سے بھی کم جاری رہی۔ بات ختم کرتے ہی صفی صاحب نے بار بار گھڑی دیکھنا شروع کر دی۔ میں ان کا مدعا سمجھ گیا اور جانے کی اجازت مانگی جو بخوشی دے دی گئی۔ واپسی میں سیڑھیاں اترتے ہوئے قاضی کفیل کا موڈ بڑا خراب تھا۔ کہنے لگا:

''یار یہ تو بالکل ہی روکھا آدمی ہے، اگر انٹرویو لینے ایک سے زیادہ بندے چلے جاتے تو کیا قیامت آجاتی''۔

پھر شکوہ کرنے لگا کہ میں پہلی مرتبہ گھر پر گیا تھا ایک آدھ نیا پرانا ناول تک اعزازی کاپی کے طور پر نہیں دیا۔ اس پر میں نے قاضی کو ایک واقعہ سنایا اور کہا کہ صفی صاحب تو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ گھوڑا گھاس سے دوستی کرلے گا تو کھائے گا کیا؟۔ یہ سنتے ہی قاضی خود بھی کسی گھوڑے کی طرح بدک گیا اور میرے فلیٹ سے ابن صفی کے دو تین ناول اٹھا کر چمپت ہو گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا کہ تم خود ہی انٹرویو کر لینا، میرے لیے تو بس یہ ناول کافی ہیں۔

فردوس کالونی میں ابن صفی کا گھر ڈھونڈنے میں کچھ وقت لگا۔ بہر حال دیر سویر میں عصر کے وقت صفی صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ فلیٹ کی سادہ سی رہائش گاہ کے مقابلے میں یہ ایک پر تکلف رہائش گاہ تھی۔ مجھے ایک آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ سامنے دیوار پر ایک خوبصورت سے بڑی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ غور سے دیکھا تو یہ اسی آرٹسٹ کا ایک فن پارہ تھا جو عموماً ابن صفی کے ناولوں کے ٹائٹل تخلیق کیا کرتا تھا۔

کچھ دیر بعد صفی صاحب ڈرائنگ روم میں تشریف لائے۔ گرمیوں کے آخری دن تھے، وہ ایک سفید کڑھا ہوا ململ کا کرتا اور سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ دریافت کیا:

''میاں کیا پئیں گے، چائے یا ٹھنڈا؟''۔

میں نے کہا:

''گرمی زیادہ ہے، پہلے پانی پلا دیجیے، پھر چائے پی لی جائے......''۔

ابھی میری بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ان کے ایک صاحبزادے شیشے کے ایک جگ میں روح افزا اور شیشے کے دو گلاس جو گلا پوش سے ڈھکے ہوئے تھے لے کر کمرہ میں آ گئے۔ صفی صاحب ہنس کر کہنے لگے:

''لو میاں! گرمی کا علاج تو آ گیا، نوش کریں''۔

کچھ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد صفی صاحب نے کرتے کی جیب سے سوالوں کا مسودہ نکالا اور کہنے لگے:

''میاں آپ تو کچھ کارل مارکس سے بھی زیادہ عظیم بدخط لگتے ہیں، آپ کی تحریر پڑھنے میں بڑی دشواری ہو رہی تھی وہ تو بھلا ہو ہمارے کاتب صاحب کا کہ انہوں نے آپ کی تحریر کو ہمارے لیے پڑھنے کے قابل بنا دیا''۔

پھر انہوں نے کتابت شدہ سوالوں کا مسودہ مجھے دیتے ہوئے کہا:

''دیکھ لیں نقل بمطابق اصل ہے کہ نہیں؟''۔

میں نے کتابت شدہ سوالات کے مسودے پر نظر ڈالی۔ کوئی غلطی نہیں تھی چنانچہ اس طرح سوال جواب کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ وہ کوئی دو ڈھائی گھنٹے تک جاری رہا۔ انٹرویو مکمل ہونے کے بعد صفی صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو انٹرویو کو حتمی شکل دینے کے بعد اسے ایک مرتبہ پڑھ کر ضرور سنا دوں۔

دن کے گیارہ بجے میں ابن صفی کے فلیٹ میں موجود تھا اور انہیں پورا انٹرویو پڑھ کر سنا رہا تھا۔ انٹرویو سننے کے بعد صفی صاحب کہنے لگے:

''اگر اس انٹرویو کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ انٹرویو کرنے والے کا تذکرہ بار بار نہ آئے تو ایک منفرد انداز کا انٹرویو ہو جائے گا''۔

ان کا کہنا تھا:

''میڈیا جس اعتبار سے ترقی کر رہا ہے مستقبل قریب میں یہی انداز پاپولر ہوگا''۔

پندرہ روزہ ''آہنگ'' میں شائع ہونے والے مضامین کی بھی اس جریدے کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی تشہیر شروع ہو جاتی اور یہ تشہیر بھی ریڈیو پاکستان کی ورلڈ سروس سے ہوتی جو ایک مقبول عام تشہیری ذریعہ تھا۔

ادھر آہنگ کے ایڈیٹر کا اصرار تھا کہ صفی صاحب کو انٹرویو میں ان کی اپنی تحریر میں ان کی ایک مشہور غزل اور ان کی فیملی فوٹوز بھی شائع کی جائیں چنانچہ اس مقصد کے تحت صفی صاحب کو پیشگی مطلع کر کے ایک مرتبہ پھر ان کے فردوس کالونی کے بنگلے پر انہیں زحمت دینی پڑی لیکن اس مرتبہ میرے ساتھ آہنگ کے فوٹو گرافر، اسکالا پیپر کا ایک رول اور ایک کالا مارکر پین بھی ساتھ تھا۔ فوٹو سیشن ہونے کے بعد میں نے صفی صاحب کو مارکر پین دیا اور اسکالا کے کاغذ پر ان کی معرکۃ الآرا غزل۔

''راہ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں''

تحریر کرنے کی درخواست کی۔

گفتگو کے دوران صفی صاحب غزل بھی تحریر کرتے رہے۔ بقول ان کے جونہی غزل کی کتابت مکمل ہوئی، انہوں نے آواز لگائی:

''بھئی ناشتہ تیار ہو گیا ہے تو لے آؤ''۔

جلد ہی ان کے صاحبزادوں نے ڈرائنگ روم کی سینٹرل ٹیبل پر سموسے اور شامی کباب گرما گرم چائے کے ساتھ سجا دیئے۔ صفی صاحب اصرار کر کے کہنے لگے:

''بھئی یہ سموسے تو بازاری ہیں جو مشتاق قریشی لے آئے تھے۔ لیکن یہ کباب خاص طور پر آپ لوگوں کے لیے گھر پر بنوائے ہیں۔ چلو اسی بہانے ہمیں پھر کباب کھانے کو مل رہے ہیں ورنہ یہ گھر والے ہر وقت ہمیں پرہیزی کھانا کھلاتے رہتے ہیں''۔

عصر کے بعد ہونے والے اس ناشتے سے فراغت کے بعد صفی صاحب کہنے لگے:

''بھئی ''آہنگ'' کی بڑی زبردست پبلسٹی ہو رہی ہے جب پرچہ مارکیٹ میں آئے تو بتا دینا، بہت سے لوگ میرا انٹرویو پڑھنے کے خواہشمند ہیں''۔

ابن صفی صاحب کا انٹرویو جب شائع ہوا تو وہ شمارہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بقول شخصے ہاٹ کیک کی طرح بکا۔ ''آہنگ'' کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس شمارے کے ایک سے زیادہ ایڈیشن چھپے۔ ابن صفی صاحب کے گھر جب میں نے چند اعزازی کاپیاں پہنچائیں تو ڈرائنگ روم میں پہلے ہی آہنگ کی ایک کاپی موجود تھی۔ میرے اعزازی کاپیاں فراہم کرنے پر بھی انہیں وہی اعتراض تھا کہ ''گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا''۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ جس طرح ریڈیو پاکستان سے انٹرویو نشر ہونے کی صورت میں چیک ملتا ہے اسی طرح ''آہنگ'' میں انٹرویو چھپنے کی زیادہ اعزازی کاپی ملتی ہے تو موصوف اس پر ہنس کر کہنے لگے:

''میاں! ''آہنگ'' والے تو سستے چھوٹے''۔

میں نے عرض کیا:

''اتنے سستے بھی نہیں۔ آخر مجھے اور فوٹو گرافر کو بھی تو معاوضہ دیا ہے''۔

یہ سن کر وہ معنی خیز انداز میں زیر لب مسکرا دیئے۔

جولائی 1980ء میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ 27 جولائی کو اپنی پسندیدہ گاڑی تیز رو سے کراچی واپس روانگی تھی۔ ریلوے بک اسٹال پر گاڑی کی آمد سے پہلے وقت گزاری کے لیے جا کھڑا ہوا۔ اسٹال پر اخبار لگے ہوئے تھے جن میں سیاہ حاشیہ میں نمایاں خبر تھی ''جاسوسی ادب کے عظیم مصنف ابن صفی کا انتقال ہو گیا''۔ یہ خبر پڑھ کر جیسے اعصاب شل سے ہو گئے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے

اعصاب پر قابو پایا۔ ایک کثیر الاشاعت اخبار خریدا اور اپنے ڈبے میں جا بیٹھا۔ گاڑی کب چلی کب رفتار پکڑی مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کیوں کہ میں ابن صفی کے انتقال تدفین اور تعزیت کی خبریں پڑھنے میں لگا ہوا تھا۔ جب اس اخبار کی خبریں پڑھ لیں تو ساتھی ہم سفر سے دوسرا اخبار پڑھنے کے لیے لے لیا اور اپنا اخبار اسے دے دیا۔ شاید میری آنکھوں سے بہنے والے کچھ آنسوؤں نے اخبار تر کر دیا تھا۔ مسافر صورت حال بھانپ کر کہنے لگا:

''کیا کوئی انتقال کر گیا؟''۔

میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ابنِ صفی صاحب کے انتقال کی خبر پر انگلی رکھ دی۔ میرے ہم سفر پھر گویا ہوئے:

''کیا یہ آپ کے کوئی عزیز تھے؟''۔

میں نے جواب میں کہا:

''عزیز از جہاں تھے''۔

اس نے مزید پرسہ دینے کے لیے دریافت کیا:

''کیا عمر ہوگی؟''۔

میں نے جواب دیا:

''52 سال، عین اپنی سالگرہ والے دن یعنی 26 جولائی کو وفات پا گئے''۔

اب میرے ساتھی مسافر نے بآواز بلند انا للہ وانا علیہ راجعون پڑھتے ہوئے اپنا اٹیچی کیس کھولا اور اوپر رکھے ہوئے ابن صفی کے ناولوں میں سے ایک ناول اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے کہا:

''اتنے بڑے ناول نگار کو یاد رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا جائے''۔

اس نے مجھے جو ناول دیا تھا وہ ابن صفی کی 1950ء میں طویل علالت کے بعد ان کا شائع ہونے والا پہلا ناول تھا، جس کا نام تھا ''اور دھواں اٹھ رہا تھا''۔ تیز رو کا ڈیزل انجن تیز رفتاری کے ساتھ دھواں اڑاتا منزل مقصود کی طرف گامزن تھا اور میں اپنے دل میں گھٹے جذبات کے ساتھ ''اور دھواں اٹھ رہا تھا'' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ابن صفی کے ساتھ گزارے گئے لمحات کسی فلم کی طرح میری آنکھوں کے آگے آ رہے تھے۔

الاعظم اسکوائر کی زیر تعمیر مسجد توحید سے قرآن خوانی کا اعلان ہو رہا تھا۔ اعلان کرنے والے مسجد کے ٹرسٹی مشتاق جوناگڑھی تھے۔ میں نے مسجد پہنچ کر ان سے دریافت کیا:

''یہ قرآن خوانی کن صاحب کے لیے کرائی جا رہی ہے''۔

کہنے لگے:

''ڈی بلاک کے اسرار صاحب کے لیے جو پہلے اس مسجد کی جگہ اپنی اوپل ریکارڈ گاڑی کھڑی کیا کرتے تھے''۔

میں نے کہا:

''وہ تو عرصہ ہوا اس فلیٹ کو خیرباد کہہ چکے تھے''۔

جواباً مشتاق جوناگڑھی نے انکشاف کیا:

''ہاں لیکن جاتے جاتے نواب چھتاری سے کہہ سن کر الاعظم والوں سے اس مسجد کی تعمیر کی اجازت دلوا گئے تھے۔ وہ مسجد توحید کے پہلے سرپرست تھے۔ اسی لیے ہم آج ان کے سوئم پر قرآن خوانی کرا رہے ہیں''۔

یوں میں بھی ابنِ صفی کے سوئم میں شریک ہو گی۔

☆☆☆☆☆